ڈاکٹر نسیم عباس احمر
لیکچرار، شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی

میرزا ادیب کی بچوں کے لیے کہانیاں ___ تجزیاتی مطالعہ

Meerza Adeeb is a great name of Urdu literature. He did'nt write only for adults but wrote stories, novels, dramas and biographies of world's renowned personalities for children as well.It is not easy to write children's literature because one must have deep interest to know about childern's activities,psychology and recuirements according to their age.Meerza Adeeb is a keen observer and knows the art of writing for children.He inculcates good habits and train them in a way, they do'nt feel imposed and find out the moral lesson naturally.This article is a critical analysis of Meerz Adeeb's children literature including short stories.

بچوں کے ادب کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ ایسا ادب جو بچوں کے لیے تخلیق کیا جائے اور جسے بچے اپنا سمجھیں چنانچہ اس ادب کی تخلیق کے لیے مصنف کو اپنے سنجیدہ پن کو چھوڑ کر بچوں جیسی معصومیت اپنانا ضروری ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ اُس کے لیے خود بچہ بننا ضروری ہوتا ہے کیوں کہ بچے کی نفسیات، دلچسپیوں اور مشاغل کے ادراک کے بغیر، ان کے لیے ادب تخلیق کرنا محال ہے اور اس ادراک کے ساتھ کہانی ترتیب دینا تو آسان ہے لیکن یہ دیکھنا بہت اہم ہے کہ کوئی کہانی، بچے کی شخصیت اور نفسیات پر کس طرح اثر انداز ہو گی کیوں کہ بچوں کے تخلیق کردہ ادب کا بنیادی مقصد، تفریح طبع کے ساتھ تعلیم و تربیت ہے۔

میرزا ادیب نے جہاں بڑوں کے لیے ادب تخلیق کیا وہیں بچوں کے لیے بھی کثیر تعداد میں کتب لکھیں، جن میں کہانیاں، ناول، ڈرامے اور سوانح و سیرت پر مبنی کتب شامل ہیں جو تعداد اور معیار؛ ہر دو اعتبار سے بچوں کے ادب کے ذخیرے میں گراں قدر اہمیت کی حامل ہیں۔ بچوں کا ادب، تخلیق کرتے ہوئے، جو بات عموماً کسی ادیب کے پیش نظر ہوتی ہے وہ اُن کا مقصدی و افادی پہلو ہے اور جہاں تک میرزا ادیب کی کہانیوں کا تعلق ہے، وہ اپنی کہانیوں میں بچوں کی اخلاقی تربیت پر خصوصی زور دیتے ہیں کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ بچوں کو اخلاقیات کا درس دیے بغیر انھیں معاشرے کا ذمہ دار شہری نہیں بنایا جا سکتا۔ ایسی صورت میں وہ نفسیاتِ اطفال کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اس بات کا پورا

شعور رکھتے ہیں کہ بچہ براہِ راست، نصیحت قبول نہیں کرتا اور اگر ایسا کرنے کی کوشش کی جائے تو اُس کی شخصیت میں باغی پن پیدا ہوتا ہے کیوں کہ وہ کسی بھی قسم کی زبردستی اور دباؤ کو برداشت نہیں کرتا لہٰذا وہ نصیحت کے کڑوے پن کو کہانی کے تانے بانے میں اس طرح ملا جلا کر پیش کرتے ہیں جیسے کونین کی گولی کو شہد میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے دراصل وہ بچوں کو اس نکتے پر لانے کی کوشش کرتے ہیں کہ معاشرے، ملک وقوم اور خاندان کے ساتھ جو حقوق و فرائض وابستہ ہیں، انھیں ان کا خیال رکھنا ہوگا۔اس تناظر میں وہ بچوں کو معاشرتی و اخلاقی اقدار کا درس دیتے ہیں لیکن نصیحت براہِ راست کرنے کی بجائے صورت و بیان واقعہ کے وسیلے سے اپنی بات، بچوں تک پہنچاتے ہیں۔اس مقصد کے لیے وہ اپنی کہانیوں میں حق اور باطل کی آویزش پیش کرتے ہیں اور حق کی جیت کے ذریعے، بچوں تک کہانی کا مقصد پہنچاتے ہیں کیوں کہ وہ اس بات کو درست نہیں سمجھتے کہ کہانی کار، کہانی کے اختتام پر اخلاقی درس کی تلقین کرے کیوں کہ بچہ، تلقین یا نصیحت سننا پسند نہیں کرتا اور نصیحت کا شائبہ ہونے پر سمجھتا ہے کہ تخلیق کار اُسے کھینچ کر اپنی مقصدیت کے دائرے میں جکڑنا چاہتا ہے۔اخلاقی اقدار کی تربیت کے حوالے سے ان کی کہانیوں میں راست گوئی، احسان مندی، خدمتِ خلق، سخاوت، اطاعتِ والدین، ایفائے عہد، رحم دلی، انصاف پسندی، شجاعت، دیانت داری، ایمان داری اور احساسِ ذمہ داری کا اظہار نمایاں ہے۔

میرزا ادیب نے اپنی کہانیوں میں راست گوئی اور ایمان داری کے جذبے کو تازہ کیا ہے۔واقعات کا بہاؤ انتہائی فطری انداز میں بچوں کو ان شخصی خوبیوں کا احساس دلاتا ہے۔''لکڑ ہارا اور گڑیا، ''سال کا آخری دن''، اور''یاسمین'' اس حوالے سے اہم کہانیاں ہیں۔''یاسمین''ایک نوعمر بچی یاسمین کی کہانی ہے، جو والدین کو بتائے بغیر پہاڑی کی دوسری جانب چلی جاتی ہے اور وہاں ایک بونے کو بسکٹ کھاتے دیکھ کر حیرانی کی حالت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔بونے کے منہ سے آدھا بسکٹ گر جاتا ہے جو یاسمین کھا لیتی ہے اور کھاتے ہی اتنی چھوٹی ہو جاتی ہے کہ غار کے دہانے سے آسانی سے اندر چلی جاتی ہے۔غار کے اندر کا منظر اُسے بہت دلفریب لگتا ہے کیوں کہ غار میں جواہرات ہی جواہرات تھے۔وہ کچھ جواہرات ہاتھ میں لے کر باہر نکلنا چاہتی ہے مگر غار سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ڈھونڈ پاتی۔کچھ دیر ستانے کے بعد دوبارہ اٹھتی ہے تو وہی بونا سامنے آ جاتا ہے۔بونا اُسے پری سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اس کے ہیرے چرانے آئی ہے۔یاسمین بتاتی ہے کہ نہیں وہ انسان ہے اور جیب میں ڈالے ہوئے تین ہیرے بھی اُسے نکال کر واپس کر دیتی ہے۔بونا، اس کی سچائی سے خوش ہو کر اُسے وہاں سے رہا کرتا ہے۔یاسمین بھی وعدہ کرتی ہے کہ وہ اپنے والدین کو بتائے بغیر آئندہ کہیں نہیں جائے گی۔یوں میرزا ادیب، یاسمین کے کردار کے وسیلے سے بچوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ سچ، بہت بڑی قوت ہے اور حالات جیسے بھی ہوں، سچ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔

''سال کا آخری دن'' میں سلیم نامی کردار، اپنے ابا جان کو اپنی سچائی کا قصہ سناتا ہے کہ کلاس میں ماسٹر صاحب کے نہ ہونے کے سبب تمام بچے شور کر رہے تھے، جن میں وہ خود بھی شامل تھا۔وہ بلی کی طرح میاؤں میاؤں کر رہا

تھا۔ ماسٹر صاحب، مسعود پر شبہ کرتے ہوئے اسے بنچ پر کھڑے ہونے کے لیے کہتے ہیں مگر سلیم راست گوئی سے کام لیتے ہوئے خود بہ خود بینچ پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں میرزا ادیب، ایک اور حربہ استعمال کرتے ہیں کہ راست گوئی کا جذبہ ابھارنے کے لیے قصہ خود نہیں سناتے بلکہ ایک بچے کی زبان سے یہ قصہ سناتے ہیں کیوں کہ بچوں کے لیے بچوں کی زبانی قصہ سننا، زیادہ موثر ہوتا ہے۔ بچے بڑوں کی باتوں کو نصیحت جب کہ اپنے ہم عمروں کی بات کو ٹھیک سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ''لکڑہارا اور گڑیا''، ایک ایمان دار لکڑ ہارے کی کہانی ہے جو مال و اسباب اور دولت کے مقابلے میں اپنی ایمان داری کو ترک نہیں کرتا اور اس ایمان داری کے بدلے وہ مالا مال ہو جاتا ہے۔ یہاں میرزا ادیب نے بچوں کی نفسیات کو بہ طور خاص ذہن میں رکھا ہے کہ بچوں کو محض ایمان داری کی نصیحت نہیں کی بلکہ اس ایمان داری کے بدلے میں انعام وکرام سے بھی متعارف کرایا ہے۔

میرزا ادیب، اپنی کہانیوں کے وسیلے سے بچوں میں مثبت اقدار کی تربیت کے خواہاں ہیں۔ سچائی اور ایمان داری کے ساتھ ساتھ وہ بچوں میں خدمتِ خلق اور امانت داری کا جذبہ بیدار کرتے ہیں، تا کہ وہ خود غرضی جیسی بیماری سے دور رہتے ہوئے معاشرے کو امن اور محبت کا گہوارا بنا سکیں۔ وہ انھیں سمجھاتے ہیں کہ ہماری بقا، انسانیت کی خدمت میں ہے اور جب تک ہم اپنے مفادات کو، دوسروں کی خاطر قربان کرنا نہیں سیکھیں گے تب تک ہم ملک وقوم کے اچھے شہری نہیں بن سکتے۔ ''بوڑھیا کی گٹھری''، ''چار دوست''، اور ''ابراہیم ادھم اور نوکرانی'' اُن کے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتی ہیں۔ ''بوڑھیا کی گٹھڑی'' میں، میرزا ادیب، بچوں کو بوڑھے لوگوں کی خدمت کی جانب مائل کرتے ہیں کہ راہ چلتے اگر کسی بوڑھے کو آپ کی مدد کی ضرورت ہو تو اس کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔ بوڑھوں کی مدد کے علاوہ اس کہانی میں امانت داری اور دیانت داری کا سبق بھی موجود ہے۔ میرزا ادیب بچوں کو مخاطب کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور کہانی کے بیان میں بچوں کی دلچسپی اور میلانات کو خاص طور پر ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں۔ وہ حیرت زائی سے بچوں کے لیے نہ صرف تفریح کا سامان پیدا کرتے ہیں بلکہ اسی تجسس کے بل بوتے پر وہ بچوں کو اپنا ہم نوا بناتے جاتے ہیں۔ ''چار دوست''، میں میرزا ادیب خدمتِ خلق اور حسن خلق جیسی مثبت اقدار کو فروغ دیتے ہیں اور بچوں کی دلچسپی کی خاطر اس کہانی میں یہ چار دوست، انسان نہیں بلکہ جانوروں کے روپ میں پیش کرتے ہیں ان میں ؛ گیڈر، بگلا، بندر اور خرگوش شامل ہیں۔

میرزا ادیب اس بات کا پوری طرح شعور رکھتے ہیں کہ بچہ جیسے جیسے کھوج اور جستجو کے عمل سے دو چار ہوتا ہے وہ تسخیر کے جذبے سے ہر شے کی کرید کرتا ہے۔ اپنے وجود سے لے کر اپنے اردگرد پھیلی کائنات تک، تمام اشیاء اُس کے زیرِ تحقیق رہتی ہیں۔ انسانوں کے ساتھ ساتھ وہ جانوروں کو دیکھتا ہے تو وہ بھی اس کے دائرہ تحقیق میں شامل ہو جاتے ہیں اور وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے پھر وہ خدمت خلق اور حسن خلق کی کارفرمائی محض انسانوں میں نہیں دکھاتے بلکہ جانوروں کو بھی اس جذبے سے سرشار پیش کرتے ہیں۔ یہ صورت بچوں میں سیکھنے کے عمل کو مزید

تیز کر دیتی ہے۔اس کہانی میں اُن کا بیان ، اساطیری مزاج کا حامل نظر آتا ہے۔اس کہانی میں خرگوش وہ کردار ہے جو ایک انسان کی بھوک مٹانے کے لیے خود کو کھانے کے طور پر پیش کر دیتا ہے۔ایسے میں وہ انسان، خرگوش سے مخاطب ہو کر اُس کی کامیابی کو نہ صرف سراہتا ہے بلکہ چاند میں ہمیشہ چمکتے رہنے کی دعا دیتا ہے۔اس ساری صورتِ حال میں، میرزا ادیب کہانی کے اختتام پر بچوں کو مخاطب کر کے چاند کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ چاند میں نظر آنے والا خرگوش ،دراصل وہی خرگوش ہے۔بچوں کا ادب تخلیق کرنے کے لیے یہ بات بہت ضروری ہوتی ہے کہ بچوں کو اس بات کا پورا یقین دلایا جائے کہ مصنف جو کچھ کہہ رہا ہے، سچ کہہ رہا ہے اور کہیں بھی جھوٹ نہیں بول رہا۔کہانی سنانے کے بعد حقیقت میں موجود مجسم شے کی طرف متوجہ کرنا جہاں انھیں اس صداقت پر ایمان کامل لانے پر مجبور کرتا ہے وہیں اُن کے تخیل کی آبیاری بھی کرتا ہے۔کہانی کا آخری حصہ ملاحظہ ہو:

''انسان بولا، ''اچھے خرگوش! یہ آگ نہیں جل سکتی اور اسے جلانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔میں بھوکا نہیں ہوں۔صرف تم جانوروں کا امتحان لے رہا تھا۔تم سب سے اچھے ہو کیوں کہ دوسروں کے لیے قربانی دے سکتے ہو۔آج سے تم چاند میں چمکا کرو گے۔لو دیکھ لو بچو! اس انسان نے جو کچھ کہا تھا درست نکلا ہے۔پورے چاند کو دیکھو۔وہاں تمھیں ایک خرگوش کی شکل دکھائی دے گی۔یہ وہی خرگوش ہے جس کا تم نے ابھی ابھی ذکر سنا ہے۔''[۱]

میرزا ادیب، دراصل اپنی کہانیوں کے ذریعے بچوں کو مشرقی اخلاقیات اور مشرقی وضع داری سکھانے کا کام کرتے ہیں۔وہ اس انداز میں کہانیوں کی بنت سازی کرتے ہیں کہ جن سے بچوں کو زندگی اور اس کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملے اور وہ معاشرے کے اصولوں کو سمجھیں جو اعلیٰ درجے کے مثالی معاشرے کے وجود کے لیے ضروری ہیں۔وہ بچوں کو تمدنی زندگی کے اسرار و رموز سے بہ خوبی آگاہ کرتے ہیں کہ معاشرے میں رہنے کے کیا اصول ہیں۔وہ معاشرے سے اُن کا رشتہ کمزور بنانے اور خیالی دنیا میں لے جانے کی بجائے معاشرے کو سمجھنے اور موافقت کے گُر سکھاتے ہیں اور معاشرے کو اپنی تمام تر سفاکیوں کے ساتھ پیش کرنے کی بجائے، اُس کو دوست کے روپ میں پیش کرتے ہیں جس سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ بچوں کی نفسیات کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں کہ نا معلوم سے بہتر تعلق استوار کرنے کے لیے اُس شے کی پیش کش کا مثبت ہونا ضروری ہے چنانچہ وہ اپنی کہانیوں کے وسیلے سے بچوں میں حسنِ سلوک کا جذبہ پیدا کرتے ہیں کہ ہمیں معاشرے میں ہر کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے تا کہ ہماری ضروریات پوری ہو سکیں۔اس بات کا درس، ان کی بہت سی کہانیوں میں ملتا ہے۔جن میں ''دوستی''، ''وہ ایک چور تھا'' شامل ہیں۔

مذکورہ تناظر میں،ان کی کہانی ''دوستی'' اہم ہے جس میں وہ باہمی یگانگت ومحبت کے ساتھ حسنِ سلوک کی اہمیت

اجاگر کرتے ہیں مگر زیرِ موضوع، وہ بچوں کو یہ بھی احساس دلاتے ہیں کہ انسان معاشرتی حیوان ہے اور معاشرے سے کٹ کر تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ معاشرے کا یہی چلن ہے اور جو کوئی اس سے ہٹ کر زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے اُسے درپیش آنے والے واقعات، اُس کی سوچ کے اس دھارے کو بدل دیتے ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ،قاسم ہے جو ہر وقت دوستوں کی شکایت کرتا اور آہستہ آہستہ وہ دوستوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے لیکن زندگی میں پے در پے آنے والے معاملات اُس پر یہ حقیقت منکشف کرتے ہیں کہ وہ تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ ایک اجنبی شخص کا حسنِ سلوک، اُس کی سوچ اور عمل کو تبدیل کر دیتا ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ صلے کی امید کے بغیر، دوستوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا چاہیے کیوں کہ یہ ہمارے فرائض میں شامل ہے۔

''وہ ایک چور تھا''، ابن ساباط نامی ایک چور کی کہانی ہے جسے چوری کرنے پر قانون کی طرف سے ملنے والی سزائیں تو اُس کو تبدیل نہیں کر پاتیں مگر شیخ جنید بغدادی کے گھر چوری کے ارادے سے جانے پر، ان کا حسنِ سلوک اُس کا دل بدل دیتا ہے اور وہ گناہ کا راستہ ترک کر کے نیک انسان بن جاتا ہے۔ یہاں دو باتیں اہم ہیں، اول: میرزا ادیب، جہاں بچوں کو چوری نہ کرنے کا درس دیتے ہیں وہیں تاریخ و مذہب کی اہم شخصیت کے مثالی کردار سے بھی متعارف کراتے ہیں۔ دوم: میرزا ادیب یہاں بھی تربیتِ اطفال میں اپنی نفسیات شناسی کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بچے، سزا و جزا میں سے جزا کی جانب متوجہ ہوتے ہیں لہٰذا بچوں کو اچھے اعمال کی طرف راغب کرنے کے لیے سزاؤں کی بجائے جزا کا تصور دینا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ابنِ ساباط کی شخصیت میں آنے والے انقلاب کو سزا کے ساتھ جوڑنے کی بجائے عالی قدر شخصیت کے کردار کے ساتھ مربوط کرتے ہیں تاکہ بچے ان شخصیات کے ساتھ لگاؤ کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔ ابنِ ساباط پر جب یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ جس کے گھر وہ چوری کرنے گیا اور جس بوڑھے کی کمر پر چوری کا سامان لاد کر اپنے ٹھکانے تک لے کر گیا اور جس کی کمر پر بار بار اس لیے مارتا کہ وہ سست رفتاری سے چل رہا ہے۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ شیخ جنید بغدادی ہیں اور وہ مکان کسی اور کا نہیں بلکہ خود جنید بغدادی کا ہے تو اس کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ کہانی سے چند سطریں ملاحظہ ہوں، جہاں کہانی انجام سے دوچار ہوتی ہے:

> ''ابنِ ساباط! تم جانتے ہو یہ کس کا مکان ہے؟
>
> میں صرف یہی جانتا ہوں کہ یہ اس بوڑھے کا مکان ہے جس نے زندگی میں مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔
>
> ابنِ ساباط، یہ مکان بغداد کے سب سے بڑے عالم فاضل اور بزرگ امام جنید کا ہے۔ بغداد کا بڑے سے بڑا آدمی بھی ان کے ہاتھوں کو بوسہ دینا اپنے لیے فخر سمجھتا ہے۔ تو امام جنید نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا؟ ایک چور کے ساتھ ایسا سلوک، یہ امام جنید تھے جو اتنی بھاری گٹھڑی اٹھا کر میرے ساتھ چلتے

رہے، اتنے بڑے بزرگ نے چپ چاپ میری گالیاں سنیں۔''۲

میرزا ادیب جہاں بچوں کو حسنِ سلوک کی اہمیت سے روشناس کراتے ہیں وہیں ہمسایوں کی اہمیت اور اُن کے حقوق و فرائض سے بھی آ گاہ کرتے ہیں۔ان کی کہانی ''گڈو''، اس کی بہترین عکاس ہے۔اس کہانی میں وہ بتاتے ہیں کہ انسان تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔زندگی کے سرد گرم کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے ہمسائے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔یوں وہ مذہبی اور مشرقی تناظر میں ہمسائے کی اہمیت اُجاگر کرتے ہیں۔یہ کہانی، ایک ماہی گیر کے گرد گھومتی ہے جو نہ صرف یتیم تھا بلکہ اُس کے کوئی رشتہ دار بھی نہ تھے لیکن ایسا ملن سار اور محبت کرنے والا تھا کہ ہر شخص، اُس کا خیال رکھتا تھا۔وہ بیمار پڑتا تو سب لوگ اُس کی تیمارداری کرتے۔وہ بھی مچھلیاں پکڑ کر لاتا تو اچھی مچھلیوں کا لفافہ پڑوسیوں میں مفت تقسیم کر دیتا اور کچھ مچھلیاں دکان دار کو فروخت کر دیتا۔وہیں ایک ہمسایہ ''گڈو'' بھی تھا اور ان دونوں کے مابین بے انتہا محبت تھی۔ماہی گیر دکان دار کے دیے لالچ میں آ کر دریا کنارے مکان میں جا بسا جہاں آس پاس کوئی نہ بستا تھا۔ماہی گیر روزانہ گاؤں آ کر اپنے پرانے طریقے کے مطابق گڈو اور تمام پڑوسیوں میں مچھلیاں بانٹ دیتا۔اُسے دریا کنارے جانے کا بہت فائدہ ہوا کہ اب وہ بڑی تعداد میں مچھلیاں پکڑ لیتا تھا۔ایک روز جب وہ بیمار ہوا گیا اور تنہائی و بے بسی کے عالم میں تھا تو اُسے پڑوسیوں کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور یہ بھی کہ انسان، لوگوں کے ساتھ ہی جی سکتا ہے، الگ تھلگ رہنا اُس کے لیے ممکن نہیں۔وہی گڈو اور پُرانے ہمسائے، وہاں پہنچ کر اُس کی تیمارداری کرتے ہیں اور ماہی گیر واپس، اُن کے درمیان، اپنے پرانے مکان میں چلا جاتا ہے۔

میرزا ادیب نے اپنی کہانیوں کے ذریعے بچوں کی سیرت سازی کی کاوش کی ہے۔وہ انھیں بہتر انسان اور بہتر شہری بنانے کے خواہاں ہیں۔اسی لیے وہ انھیں اخلاقی و معاشرتی اقدار کی تلقین کرتے ہیں۔مادہ پرستی سے دور ہو کر اپنے اندر درویشی و سخاوت پیدا کرنے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں جس کے لیے مذہبی شخصیات کو مثال بنا کر پیش کرتے ہیں۔اس تناظر میں لکھی گئی کہانیوں میں: ''دروازہ''، ''ابراہیم ادھم اور نوکرانی'' اور ''سخاوت'' شامل ہیں۔کہانی، ''دروازہ'' میں حضرت عمرؓ، ملکی نظم و نسق چلانے والوں کو درویشی کی اہمیت واضح کرتے ہیں اور ان کا حسنِ تدبیر، ایک گورنر کے دل میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ عوام کی خدمت کے لیے اس عہدے پر مامور ہے۔''ابراہیم ادھم اور نوکرانی'' میں ایک نوکرانی، ابراہیم ادھم کو یہ احساس دلاتی ہے کہ درویشی بڑی دولت ہے اور جس کے بعد ابراہیم ادھم، شان و شوکت ترک کر کے عاجزی اختیار کر لیتے ہیں۔اسی طرح ''سخاوت'' میں حضرت امام شافعی کی سخاوت کے واقعات کے ذریعے، بچوں کو سخاوت کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ایفائے عہد بھی اہم اخلاقی قدر ہے، میرزا ادیب کی کہانی ''وعدہ'' میں حضرت عمر فاروقؓ کی رحم دلی اور ایفائے عہد، ایران کے ایک صوبے کے بہادر گورنر ہرمزان کو ایک جاں نثار مسلمان سپاہی میں تبدیل کر دیتی ہے۔

میرزا ادیب کی کہانیوں میں وہ تمام موضوعات، ماحول اور مناظر نظر آتے ہیں، جو بچوں کی دلچسپی کا مرکز ومحور ہوتے ہیں۔ بلکہ بقول طاہر مسعود کہ ''وہ جب بچوں کے لیے لکھتے تو خود بھی بچے بن جاتے ہیں۔'' [۳] بچہ جب تسخیر کے سفر پر گامزن ہوتا ہے تو وہ کائنات کی تمام اشیاء کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس موقع پر اُسے ایسے رہنما کی ضرورت پڑتی ہے جو اُسے اس کائنات سے متعارف کرائے اور میرزا ادیب، اپنی کہانیوں کے وسیلے سے رہنما کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ وہ بچوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ کائنات کے ساتھ ان کا انسلاک، محبت اور ہمدردی کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے۔ لہٰذا وہ پھولوں، پودوں، درختوں، تتلیوں، سبزہ زاروں اور جانوروں سے محبت کا درس دیتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں موجود جانوروں میں دانش مندی، بزرگی اور انسان دوستی کی اقدار واضح طور پر موجود ہیں۔ اس حوالے سے ''عقلمند بندر''، اور ''دو بوڑھے''، جانوروں کی دانش مندی کی واضح عکاس کہانیاں ہیں۔ اسی طرح ''پیتیل کی چابی'' میں وہ درختوں، پھلوں، پھولوں، تتلیوں غرض یہ کہ کائنات کی تمام خوب صورتیوں سے محبت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

خیر وشر کی کش مکش اور ان کی ماہیت قلب، میرزا ادیب کی کہانیوں کا اہم موضوع ہے، جن کے ذریعے وہ بچوں کے سامنے خیر اور شر کا فرق واضح کرتے ہیں اور باطل کے مقابلے میں حق کی جیت کے ذریعے اُن کے سامنے حق کا روشن راستہ پیش کرتے ہیں تاکہ بچے خیر کے مقابلے میں شر میں زیادہ دلچسپی نہ لیں۔ اُن کی کہانیوں میں موجود کردار، جا بجا اپنے کردار کی تقلیب کرتے نظر آتے ہیں اور وہ شر کا راستہ چھوڑ کر خیر کا راستہ اپناتے ہیں۔ ''شبنم کا ہار'' میں بادشاہ کے آمرانہ رویے کے مقابلے میں حق اور سچائی کی جیت اس امر کی واضح عکاسی کرتی ہے۔

میرزا ادیب، اپنی کہانیوں کے ذریعے بچوں کو تعلیم اور دانش مندی کی اہمیت سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ وہ بچوں کو ملکی وقومی ترقی کا وسیلہ سمجھتے ہیں لہٰذا انھیں اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ جسمانی قوت اور تنومندی کبھی بھی ذہانت کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ ''شیروں کا بادشاہ'' میں ایک گدھا، اپنی ذہانت اور دانائی کے بل بوتے پر خود سے کئی گنا طاقت ور شیر سے جیت کر، شیروں کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ بچوں کی تعلیم کے حوالے سے وہ ان کی اس حوالے سے بھی تربیت کرتے ہیں کہ پڑھائی کے دوران خود غرضی اپنانے کی بجائے اپنے ساتھی ہم جماعتوں کی مدد کرنا اچھی بات ہے۔ ''سال کا آخری دن''، ایسی کہانی ہے جس کے وسیلے سے وہ بچوں کو اچھے طالب علم بنتے ہوئے ہم جماعتوں کی مدد کرنے کا بھی درس دیتے ہیں۔ وہ اس بات کا پورا احساس رکھتے ہیں کہ ملکی وقومی سطح پر تبدیلی لانے کے لیے طالب علمی کے زمانے سے ہی مثبت اقدار کی ترویج ضروری ہوتی ہے۔ ''سب سے خوب صورت محل''، میں، خوب صورت محل، اچھے اعمال کے صلے کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے کہ نیک اعمال کا نتیجہ ہمیشہ نیک ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی کہانیوں میں سستی، کاہلی اور لاپروائی کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں تاکہ بچوں میں احساسِ ذمہ داری پیدا کیا جاسکے۔ ان کی کہانی، ''ایک ڈبہ'' میں یہ صورت واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے جس میں کہانی کا مرکزی کردار ایک بچہ اسلم ہے، جسے اس کے ابا جان احساس دلاتے ہیں کہ جو کام بھی کیا جائے، اُسے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کیا جائے اور اپنی

اشیاء کی حفاظت خود کرنی چاہیے۔

میرزا ادیب کی کہانیوں میں احساس کی سطح پر حقیقت پسندی موجود ہے۔اُن کی کہانیوں میں مشرقیت اور پاکستانیت کی روح واضح طور پر دھڑکتی سنائی دیتی ہے۔اپنے عہد اور اقدار سے جُڑت ان کہانیوں میں نمایاں ہے یہی وجہ ہے کہ ماں باپ کا اپنی اولاد سے بے لوث تعلق، بہن بھائیوں کی محبت اور بزرگوں کا ادب اور جذبۂ مدد جیسے جذبوں کی عکاسی ملتی ہے۔''گونگی بہن''، بہن بھائی کی روایتی مشرقی محبت کی نمائندگی کرتی ہے۔ایک بھائی، اپنی گونگی بہن کے لیے اپنی قوتِ گویائی کی قربانی دیتا ہے اور پھر وہی بہن، اپنے بھائی کی قوتِ گویائی کے لیے تگ و دو کر کے اُس کی کھوئی ہوئی قوتِ گویائی واپس دلاتی ہے۔اس طرز کی کہانیوں میں جہاں احساس اور رشتوں کے تقدس کی حد تک حقیقت پسندی موجود ہے وہیں یہ مہم جوئی، بچوں میں تحرّک کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور ان کی قوتِ متخیلہ کی تربیت کا کام بھی انجام دیتی ہے۔بہن بھائی کی محبت کے علاوہ، ان کی کہانیوں میں والدین کی خدمت کا درس بھی ملتا ہے۔ان کی کہانی ''باپ کی خدمت'' کا مرکزی کردار کلاب، جری سپاہی، نہایت اطاعت شعار اور فرماں بردار بیٹے کے روپ میں نظر آتا ہے۔حضرت عمرؓ اُسے اس لیے میدانِ جنگ میں نہیں لے کر جاتے کہ اُس کے جانے سے اُس کے نابینا باپ کو تکلیف ہوگی اور وہ حضرت عمرؓ کے حکم کی تعمیل میں پہلے کی طرح اپنے باپ کی خدمت کرنے لگتا ہے۔اس کہانی میں بات اہم ہے کہ میرزا ادیب بچوں کی تربیت کے لیے ان کے ذہن کو منفی سے مثبت کی جانب حرکت دینے کی بجائے مثبت کی جانب گامزنِ سفر رکھتے ہیں تاکہ انھیں باور کرواسکیں کہ والدین کی خدمت، اہم ترین فریضہ ہے جس کے لیے کاروبارِ حیات، ترک کیا جا سکتا ہے۔

بچوں کے ادب کی تخلیق کا ایک مقصد، معلومات افزائی کا عنصر ہے۔میرزا ادیب، معلومات کو، واقعے اور اس کے بیان کی کرافٹ میں اس طرح گوندھتے ہیں کہ بچے معلومات حاصل کرتے ہیں اور تفریح بھی جاری رہتی ہے۔معلومات افزائی کے تناظر میں دیکھا جائے تو وہ مذہب اسلام کے درخشاں مثالی استعاروں، بہادر بادشاہوں، سپہ سالاروں اور ادباء و دانش وروں کے کردار وعمل کے ذریعے معلومات اور تربیت کا فرض انجام دیتے ہیں۔ان مذہبی شخصیات میں؛ حضرت عمرؓ، حضرت امام حسینؓ، حضرت امام غزالیؒ، حضرت ابراہیم ادھم، حضرت عمر بن عبدالعزیز، حضرت عمر بن العاص، حضرت امام شافعی، امیر تیمور، سلطان محمود غزنوی، بادشاہ بابر، ہمایوں، شیر شاہ سُوری، شاہ جہاں، چاند بی بی، خالدہ ادیب خانم (مصنفہ)، مصطفیٰ کمال، ہوریشس (روما کی تاریخ کا بہادر سپہ سالار) اور امام جنید بغدادی شامل ہیں۔

میرزا ادیب، مذکورہ عظیم شخصیات کا تعارف، ان کے کردار وعمل کے ذریعے پیش کرتے ہیں اور تاریخی واقعات کے بیان کے ذریعے وہ بچوں کو انصاف پسندی، درویشی، بہادری اور دیگر اخلاقی اقدار کی اہمیت وفضیلت بیان کرتے

ہیں۔ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''باپ کی خدمت'' میں موجود تمام کہانیاں اسی تناظر کی بہترین مثال ہیں۔یوں ان کی کہانیوں میں موجود مقصدیت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے لیکن یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ واقعہ نگاری پر قدرت رکھتے ہیں اور مقصد واقعے کے پردے میں ملفوف ہو کر سامنے آتا ہے۔واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ وہ تحیر، تجسس اور تفکر کو بھی دعوتِ فکر دیتے ہیں جس سے ان کی کہانیوں میں دلچسپی اور شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔کہیں کہیں داستانی طرزِ بیان بھی ملتا ہے۔مثال کے طور پر ''سنہری درخت'' کی فضا داستانی ماحول کی حامل ہے۔کہانی کا موضوع اور پیش کش دونوں میں داستانوں جیسا تحیر، تجسّس اور فوق الفطرت عناصر موجود ہیں۔درختوں کی وجہ سے کسی بستی کا خوب صورت لگنا، پھر انھی درختوں کا خزاں رسیدہ ہونا، ایک بوڑھے شخص کا بستی میں آ کر سنہری درخت کے بارے میں بتانا، اسی بوڑھے کے پوتے کا اس سنہری درخت کی تلاش میں نکلنا، راستے کی مشکلات کو برداشت کرتے ہوئے سنہری درخت کے پتے لا کر ان درختوں پر ڈالنا اور چند ہی گھنٹوں بعد تمام درختوں کا ہرا بھرا ہو جانا، ایسے امیجز ہیں جو خاص طور پر داستانوں سے مناسبت رکھتے ہیں۔تحیرّ آفرینی، کہانی کا جزوِ لاینفک ہوتا ہے اور تحیر، تخیل کو وسعت دیتا ہے۔فوق الفطری، عناصر اور داستانی ماحول اگر چہ، بچوں کی معلومات میں تو اضافہ نہیں کرتا لیکن تخیل کی امکانی دنیا کو ضرور دائرہ گرفت میں لاتا ہے اور مہم جوئی کے عنصر کی موجودگی، اُن میں تحرک کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

مافوق الفطرت مخلوقات؛ جن، پری، بھوت وغیرہ کا ذکر کرنا، قوتِ متخیلہ کو بڑھاتا ہے۔یوں بھی یہ نسلِ انسانی کی ابتدا کی یادگار ہیں کیوں کہ جب انسان فطرت کی پر اسرار قوتوں سے خوف زدہ ہوا تو اس نے اپنے ذہنی واہموں کی تجسیم کا عمل شروع کر دیا۔میرزا ادیب کی کہانیوں میں خاص طور پر پریوں کا تصور ملتا ہے۔پریوں کا بھیس بدلنا، غائب ہو جانا اور چھڑی گھما کر نعمتوں سے نوازنا، بونوں کی مخلوق کا ملنا اور بسکٹ کھانے پر بونا بن جانا جیسی تمثالیں بچوں کے لیے تفریح، تحیر اور تفکر کا سامان پیدا کرتی ہیں۔مصنف نے کہیں بھی ان امیجز کے ذریعے دہشت انگیزی یا خوف کا تاثر پیدا نہیں کیا بلکہ ان کی قوتِ متخیلہ کے لیے تحریک کا کام لیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی اس قسم کی کہانیاں، کہیں بھی منفی اثر مرتب نہیں کرتیں۔''پری کے تحفے''، ''بوڑھیا کی گٹھڑی''، ''شبنم کا ہار'' اور ''یاسمین'' اس حوالے سے اہم کہانیاں ہیں، جن میں ان کا بیان اتنا سحر انگیز ہے کہ بچے کہانی کے ابتدا ہی سے واقعات کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ہمہ وقت حیرت کی کیفیت میں ہوتے ہیں کہ اب کیا ہو گا؟ اِس تناظر میں، ''کیلے کا چھلکا'' سے ابتدائی جملے ملاحظہ ہوں:

> ''ثریا دس برس کی ایک لڑکی تھی۔بڑی اچھی، بڑی نیک، بڑوں کا ادب کرنے والی اور چھوٹوں سے محبت کرنے والی۔اس کی ایک عادت تھی، وہ عادت یہ تھی کہ جب بھی کسی بازار میں سے گزرتی تھی تو......مگر نہیں بھئی، ابھی تمھیں اس کی عادت سے متعلق کچھ نہیں بتاتے پہلے یہ تو سن لو کہ اس کے ساتھ ہوا کیا، اور جو کچھ ہوا، اس نے اس سے کیا سیکھا، کیوں ٹھیک ہے نا بچو! اچھا تو سنو!''[۴]

درج بالا اقتباس سے صاف عیاں ہے کہ وہ بچوں کو مخاطب کرنے اور ان تک اپنی بات پہنچانے کا ہنر بہ خوبی جانتے ہیں۔ اقتباس میں موجود چھوٹے چھوٹے جملے، تجسّس پر مبنی فضا، خطابیہ آہنگ اور وضاحتی انداز، بچوں کے مزاج سے خاص مناسبت رکھتا ہے۔ کہانی، لکھنے سے زیادہ سننے کی چیز ہے اور جب بات بچوں کی ہو تو اس جملے کی سچائی مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔ میرزا ادیب، اس بات کا پورا شعور رکھتے ہیں اسی لیے وہ کہانی اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ بچے، مصنف کی کہی گئی باتوں میں موجود صداقت پر ایمان لے آئیں اور یہ نہ سمجھیں کہ مصنف حیلے سے اپنے مقاصد کی تبلیغ چاہتا ہے۔

میرزا ادیب کی کہانیوں کے پلاٹ سادہ، زندگی سے بھرپور اور متحرک ہیں۔ واقعات و عمل آپس میں مربوط اور تعجب، سنسنی اور جوش کے حامل ہیں۔ کہانی میں دلچسپی کا عنصر ابتدا سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔ کہانی کی ابتدا کے لیے مختلف تکنیکیں استعمال کی گئی ہیں۔ کبھی وہ انجام سے کہانی کا آغاز کرتے ہیں تو کبھی کسی کردار کے تعارف سے بات شروع ہوتی ہے اور کبھی کہانی بیانیہ انداز میں ڈھلتی ہے۔ کہانی اور واقعات کا ٹیمپو معتدل ہے۔ نہ اتنا تیز کہ بچہ اس کے بہاؤ کے ساتھ نہ چل سکے اور نہ اتنا سست کہ بچہ اکتاہٹ محسوس کرے بلکہ واقعات کا ایسا تسلسل ہے جو بچے کی فہم اور تخیل سے مناسبت رکھتا ہے۔ انجام، عموماً طربیہ ہے اور جہاں المیہ جنم لیتا ہے وہاں المیاتی شدت نہیں ملتی۔

جہاں تک میرزا ادیب کی کہانیوں کے موضوعات کا تعلق ہے، ان کی کہانیوں میں کبھی ایک اور کبھی ایک سے زیادہ موضوعات بھی ملتے ہیں لیکن خاص طور پر وہ ایک ہی موضوع کو بہ طور خاص پیش کرتے ہیں کیوں کہ بچے کا ذہن ایک موضوع پر زیادہ بہتر انداز میں مرکوز ہوتا ہے اور زیادہ موضوعات کی صورت میں وہ ارتکاز سے کام نہیں لے پاتا۔ بچوں کا ادب اس بات کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ موضوع کہانی سے خود بخود ابھرے لہٰذا میرزا ادیب اس بات کا خیال رکھتے ہیں اور کردار، واقعات اور مواد کے ذریعے بچے کو اس مخصوص موضوع تک پہنچنے میں مدد دیتے ہیں جس تک وہ انھیں پہنچانا چاہتے ہیں۔ وہ نتیجہ، ضرب الامثال کی صورت میں بچوں کے سامنے پیش کرنے کی بجائے بچوں کی ذہن سازی کرتے ہیں کہ صورتِ واقعہ سے از خود نتائج اخذ کریں لیکن نتائج کے استنباط میں وہ ٹارچ لے کر انھیں راستہ ضرور دکھاتے ہیں تاکہ وہ بھٹکنے نہ پائیں۔

میرزا ادیب کی کہانیوں کے پلاٹ اور کردار آپس میں مربوط ہیں۔ کہانی کے مرکزی کردار عموماً بچے ہیں کیوں کہ بچے ان کرداروں کے ساتھ زیادہ مناسبت محسوس کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ، جانور، درخت، پرندے، پھول، تتلیاں، چور، بزرگ، پریاں اور بونے بھی ان کی کہانیوں کے کردار بنتے ہیں اور جہاں کہیں فوق الفطرت کردار سامنے آتے ہیں وہ خوف کی بجائے تحیر اور فکر انگیزی کی فضا بناتے ہیں۔

وہ خیر کے نمائندہ کرداروں کو بے حد نیک اور شر کے نمائندہ کرداروں کو انتہائی بد ظاہر کرتے ہیں تاکہ بچے کا

معصوم ذہن خیر اور شر کو اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ شناخت کر سکے۔ان خوبیوں سے قطع نظر، ایک جگہ ایک خامی بھی ملتی ہے کہ ان کی کہانی ''سال کا آخری دن'' میں کردار کی ابتدا میں بتائے جانے والے کردار کا نام سلیم ہے، جو آگے چل کر کہانی کے اختتام تک ''علیم'' میں بدل جاتا ہے یعنی میرزا ادیب کردار کا نام آگے چل کر مختلف لکھ جاتے ہیں۔

میرزا ادیب، کہانیوں میں موجود زبان و بیان کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔وہ کہیں بھی بچوں کی اوائلِ عمر کی غلط زبان استعمال نہیں کرتے۔الفاظ سہل اور جملے مختصر ہوتے ہیں۔مرکب اور پیچیدہ جملوں سے گریز کرتے ہیں۔کسی کردار کو بیان کرتے ہوئے اس کی مکمل جزئیات پیش کرتے ہیں تا کہ بچے اپنے تصور میں اس کا پورا ہیولیٰ بنا سکیں۔کہیں کہیں خطابیہ انداز اور بول چال پر مبنی لب و لہجہ اپناتے ہیں۔بعض اوقات استفہامیہ لب و لہجے کا بھی استعمال کرتے ہیں کیوں کہ استفہام، بچوں کے ننھے ذہن پر دستک کا کام کرتا ہے۔مقصدیت کی لگن میں وہ کہیں بھی، زبان و بیان کو قربان نہیں کرتے۔مختصر اور بے ساختہ فقروں کے ساتھ ساتھ بعض اوقات تکرار کی تکنیک بھی اپناتے ہیں کہ وہ جس نکتے پر بچوں کو مرکوز کرنا چاہتے ہیں اس نکتے کی نہ صرف یاد دہانی کراتے ہیں بلکہ وضاحت بھی کرتے ہیں۔''علاج'' ایک کنجوس کی کہانی ہے،اس کا ابتدائی جملہ دیکھیں:

''ایک تھا کنجوس، بے انتہا کنجوس، اتنا کنجوس کہ ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتا تھا۔''۵

اسی کہانی سے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو، جس میں انتہائی بے ساختہ انداز میں کہانی لکھنے کی بجائے، کہانی سنانے کا ہنر واضح ہے:

''ہاں بھئی کنجوس کے بیٹے کا نام نادر تھا۔اچھا تو جب نادر نے یہ کھانے دیکھے اور ان کی خوشبو اس کی ناک میں گئی تو اُسے بس مزا ہی آ گیا۔ہیں...... یہ سب میرے لیے ہیں۔وہ ایک دم حیران ہو گیا۔کہاں تو ایک روکھی روٹی اور پانی جیسا شوربہ اور کہاں اتنے سارے کھانے۔''٦

میرزا ادیب کی کہانیوں میں مواد کی پیش کش میں مبالغہ آفرینی کا پہلو نہیں ملتا اور نہ ہی وہ مطالبِ مفید کو مبلغانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ماحول اور کردار کی منظر نگاری، پوری جزئیات کے ساتھ کرتے ہیں تا کہ پوری تصویر بچے کی آنکھوں کے سامنے پھر سکے۔ان کی کہانیوں کی زبان سادہ ضرور ہے مگر روکھی پھیکی نہیں۔نیز وہ زبان کے معیاری اظہار کو اہمیت دیتے ہیں لیکن ایک کہانی ''یاسمین'' میں وہ ''بسکٹ'' کو مذکر باندھنے کی بجائے صیغہ تانیث میں پیش کرتے ہیں۔جملہ ملاحظہ ہو:

''............وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اب کیا کرے کہ اس کی نظر آدھی بسکٹ پر پڑی، یہ آدھی بسکٹ بونے کے منہ سے گر پڑی۔''۷

میرزا ادیب کی کہانیوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بچوں کے ادب کی تخلیق کا فن جانتے ہیں اور یہ بات پوری طرح سمجھتے ہیں کہ مقصدیت کو ادبیت کی شان تک کیسے پہنچایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بچوں کے لیے لکھی جانے والی یہ کہانیاں جہاں بچوں کے لیے انتہائی مفید اور دلچسپ ہیں، وہیں بڑوں کو بھی اُن کی معصومیت سے بھرپور زمانے میں لے جانے کا کام کرتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ میرزا ادیب، شیروں کا بادشاہ، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۶۹

۲۔ میرزا ادیب، ڈالیاں، پنجاب بک ڈپو، لاہور، س ن، ص ۸۷/ ۸۸

۳۔ طاہر مسعود، بچوں کے میرزا ادیب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۶

۴۔ میرزا ادیب، شیروں کا بادشاہ، ص ۱۰۴

۵۔ ایضاً، ص ۲۲

۶۔ ایضاً، ص ۲۳

۷۔ میرزا ادیب، ڈالیاں، ص ۶۷